ذرا پھر سے کہنا

امجد اسلام امجد

امجد اسلام امجد کی تصنیفات

شاعری

۱- برزخ

۲- ساتواں دَر

۳- فشار

۴- ذرا پھر سے کہنا

۵- آنکھوں میں ترے سپنے (گیت)

تراجم

۶- عکس (فلسطینی شاعری)

۷- کالے لوگوں کی روشن نظمیں (نیگرو شاعری)

سفرنامہ

۸- شہر در شہر

تنقید

۹- نئے پرانے (زیرِ طبع)

کالم

۱۰- چشمِ تماشا (زیرِ طبع)

ذرا پھر سے کہنا

ذرا پھر سے کہنا

امجد اسلام امجد

○
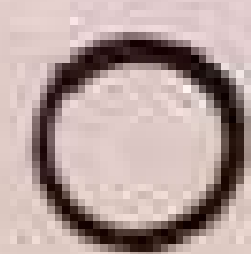
ماورا پبلشرز
۳ - بہاولپور روڈ - لاہور

باذوق لوگوں کے لیے
ھماری کتابیں
خوبصورت کتابیں

تزئین واہتمام اشاعت

خالد شریف

ماورا

ضابطہ

ناشر : خالد شریف
طابع : نوید احمد۔ سن رائز پیکجز، ۸ ڈیوس روڈ لاہو
ادارہ : ماورا پبلشرز
۳۔ بہاولپور روڈ، لاہور
فون: ۲۱۱۳۱۱

روشین امجد

تحسین امجد

اور

علی ذیشان امجد

کے نام

سمے کے سمندر، کہا تُو نے جو بھی، سُنا پر نہ سمجھے
جوانی کی ندّی میں تھا تیز پانی، ذرا پھر سے کہنا

❋

میرے پہلے تینوں شعری مجموعوں برزخ (۱۹۷۴ء) ساتواں در (۱۹۷۸ء) اور رفتار (۱۹۸۲ء) کے درمیان چار چار برس کا وقفہ تھا "ذرا پھر سے کہنا" چھ برس کے بعد آرہی ہے۔ یہ گویا اعلان ہے اس بات کا کہ اب زمانی اعتبار سے کچھ چیزیں بدلنا شروع ہوگئی ہیں اور شاید آئندہ کتاب کا درمیانی وقفہ اس سے بھی زیادہ ہو! کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ شاید چیزیں نہیں بدلتیں، اُن کو دیکھنے والی آنکھیں، اُن پر سوچنے والے ذہن اور اُن سے متاثر ہونے والے دل بدل جاتے ہیں یا پھر شاید یوں ہے کہ تبدیلی کا عمل دونوں طرف واقع ہوتا ہے! یہ بھی ممکن ہے کہ کہیں کچھ بھی نہ بدلا ہو اور ہم محض ایک واہمے میں اسیر ہوں۔ بقول میرؔ

یہ توہم کا کارخانہ ہے
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

غالبؔ نے بھی شاید ایسے ہی کسی عالم میں کہا تھا کہ

لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم
دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے، چہ دنیا و چہ دیں

اصل حقیقت جو بھی ہو بہر حال ایک بات طے ہے کہ وقت انسانوں اور واقعات کے درمیان ایک غیر مرئی دھاگے کی طرح نہ صرف موجود رہتا ہے بلکہ ہمہ دم تہہ تہ نئے ڈیزائن اور پیٹرن (PATTERN) بناتا چلا جاتا ہے۔ میری پہلی کتاب "برزخ" میری بیوی فردوس کے نام معنون ہے جو اُس وقت میری منگیتر تھی اور یہ چوتھی کتاب اُن تین خوبصورت پھولوں کے نام ہے جو قدرت نے ہمارے مشترکہ آنگن میں مہکائے ہیں۔ برزخ کا انتساب لکھتے وقت

میں نے شاید ان بہت سی باتوں کو سوچا بھی نہیں تھا جو گزشتہ چودہ برس میں ظہور پذیر ہوئیں اور کسے معلوم ہے آج یہ سطریں لکھتے وقت میں جو کچھ سوچ رہا ہوں آگے چل کر وہ کس رنگ میں صورت پذیر ہوگا۔ میر کا ایک اور شعر یاد آرہا ہے

جائے عبرت ہے خاکدانِ جہاں
تو کہاں منہ اُٹھائے جاتا ہے

مگر مشکل یہ ہے کہ اس کے بغیر اور کوئی چارہ بھی تو نہیں، اس "خاکدانِ جہاں" میں اس "انگارۂ خاکی" کو بہر حال جلنا، چمکنا، دمکنا، سُلگنا اور بُجھنا ہے اب ان سب کیفیتوں کا کون سا تناسب کس کے حصے میں آتا ہے اور کیوں آتا ہے، یہی وہ بنیادی سوالات ہیں جنہیں حل کرنے میں عقل و دانش اور ادراک و وجدان اپنے اپنے طور پر سرگرداں رہتے ہیں مگر آخری نتیجہ وہی نکلتا ہے۔ یعنی

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا
واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

وقت کی ہیئت، مفہوم، رفتار اور انسانی زندگیوں کے ساتھ اس کے تعلق پر بہت بڑے بڑے ذہنوں نے بہت کچھ سوچا اور لکھا ہے اور بڑے بڑے انوکھے ڈھنگ سے لکھا ہے اور آئندہ بھی لکھتے رہیں گے کہ انسان کے باطنی اور خارجی دونوں نوعیت کے سفر اس بنیادی حوالے کے بغیر سمجھے اور سمجھائے نہیں جاسکتے، میں اس قافلے کا ایک ادنیٰ سا مسافر ہوں اور اپنی محدود سمجھ بوجھ کی مدد سے اپنی تحریروں میں اس مسئلے کے صحرائے اعظم کو عبور کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں اپنی چالیسویں سالگرہ کے حوالے سے میں نے جب نظم "ابھی کچھ دنوں میں" لکھی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں ایک پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہوں اور اب اس کے بعد کا سارا سفر دوسری طرف اُترنے کا ہے مگر دھند اس قدر ہے کہ کسی بھی طرف کا رستہ ٹھیک سے دکھائی نہیں دیتا۔ زندگی کے چالیس برس جمع ہوئے ہیں یا تفریق؟ اس پرانے سوال سے قطع نظر یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سارے حساب کتاب میں خود ہم کس جگہ پر کھڑے ہیں! مذہب اور سائنس دونوں ہمارے کانوں میں سرگوشیاں کرتے ہیں مگر اُن کی آوازیں اسی طرح سے آتی ہیں جیسے باکنگ رنگ میں

راؤنڈ کے خاتمے پر باکسر کے کانوں میں اُس کے مینجر اور ساتھی کچھ سرگوشیاں کرتے ہیں وہ ان کو سن کر سر تو ہلاتا ہے مگر اُس کی سمجھ میں سوائے اپنے حریف کے لگائے ہوئے اور متوقع مکوں کے اور کچھ بھی نہیں آتا۔ کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے انسان کو زندگی کے رِنگ میں ایک غیر مرئی مگر انتہائی وحشی اور طاقتور حریف کے سامنے ڈال دیا گیا ہے وہ اندھوں کی طرح اپنا دفاع کرتا تو ہے لیکن کر نہیں پاتا اور راؤنڈ پر راؤنڈ گزرتے چلے جاتے ہیں۔

مایوسی کے اس سارے منظر نامے کے باوجود ہمارے اندر کہیں کوئی چیز ایسی ضرور ہے جو ہتھیار ڈالنے کو تیار نہیں ہوتی ایک ایسا دیا ہے جو وقت کی وحشی اور منہ زور ہوا کے سامنے بھی جلنے کی کوشش سے باز نہیں رہتا، ایک ایسا پھول ہے جو صحرا کی جھلسی ہوئی ریت میں بھی اپنے ہونے کا اعلان کرنا چاہتا ہے، ایک ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی ہے جو بھاگنے کی بجائے لپکتی ہوئی تلواروں کے رُخ پر سینہ تان کر کھڑا ہو جاتا ہے اور گرتے گرتے بھی اپنا علم بلند رکھنا چاہتا ہے۔ سو وقت اور انسان کے مابین جاری اس کش مکش میں انسان کے پاس زندہ رہنے (SURVIVAL) کے انتہائی طاقتور اور پُر اسرار جذبے اور خواب دیکھنے کی لا محدود صلاحیت ہی وہ دو ہتھیار ہیں جن سے وہ اپنے شب و روز میں معنی تلاشتا اور تراشتا ہے جب زیادہ موج میں آتا ہے تو "شب آفریدی چراغ آفریدم" کے نعرے لگانے لگتا ہے اور بہت ہی تھک جائے تو "لائی حیات آئے قضا لے چلی، چلے" کا ورد کرنے لگتا ہے مگر محسوس یوں ہوتا ہے کہ اصل معاملہ ان دونوں حدوں کے درمیان کہیں ہے! سو بہتر ہے کہ انہیں اسی علاقے میں تلاش کیا جائے۔

"ذرا پھر سے کہنا" کے عنوان میں گزشتہ کی تکرار اور اعادے کی ایک خواہش جھلک رہی ہے مگر یہ صرف ایک خواہش ہے میرا منشور نہیں کہ میں، تو ہمیشہ ماضی حال اور مستقبل کو ایک ہی تسلسل کی کڑیاں سمجھتا ہوں اور زندگی کو ایک متحرک اور آگے کی طرف بڑھتی ہوئی قوت کے طور پر دیکھتا ہوں۔ کبھی کبھی پیچھے مُڑ کر دیکھنے کی خواہش بھی اسی عمل کا حصہ ہے کہ وقت کی عمارت میں آئندہ کے تصور کے لیے رفتہ کا وجود ایک مرکزی ستون کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہر گزرنے والا لمحہ اس ستون کے محیط میں ایک اینٹ کی طرح جڑتا چلا جاتا ہے اور یوں آنے

والا کل "آج" میں اور "آج" گزرے ہوئے کل میں بدلتا چلا جاتا ہے۔ یہ بات میں نے اسی کتاب میں شامل نظم "آج" میں ذرا وضاحت کے ساتھ کہنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ اس ابتدائیے کو میں اُسی نظم کی اختتامی لائنوں کے ساتھ ختم کرتا ہوں۔

سو لے وقت کی حیرت میں کھو جانے والی آنکھ، ٹھہر
آج کے پُل پر رُک کر آگے پیچھے دیکھ
روشنی اور تاریکی شاید ایک ہی ڈال کے پتے ہیں
لمحوں کا یہ فرق نظر کا دھوکا ہے
وقت کی اس ناوقتی کے سیلاب میں، شاید
آج ہی واحد لمحہ ہے!

عمرِ رواں کی دہشت میں کھو جانے والی آنکھ، ٹھہر

امجد اسلام امجد
۲۲ راگست ۱۹۸۸ء

۲۲، ممتاز سٹریٹ
گڑھی شاہو، لاہور

ترتیب

ایک حمدیہ نظم

مرے خیالوں کے پیچ و خم سے
خلا کی بے سمت وسعتوں تک
جہان اندر جہان بے انت گردشوں کا جو سلسلہ ہے
یہ سب اُسی ایک ذاتِ واحد کا آئنہ ہے

وہ ذاتِ واحد
کہ جس کے اثبات کے جَلو میں وہ کہکشائیں بھی چل رہی ہیں
جو اپنی رفتارِ روشنی میں اَزل سے میری طرف رواں ہیں
مگر نہاں ہیں،
مگر نہاں ہیں وہ میری آنکھوں کی دسترس سے
کہ میری آنکھیں تو روشنی کے بس ایک ذرّے،
بس ایک سُورج کی سلطنت میں بھٹک رہی ہیں
یہ ایک سُورج کہ جس کی مٹّی سے میرے دن رات پھُوٹتے ہیں

یہ اُس کے گھوڑے کی گردِ پا ہے
یہ میری ہستی کا حاشیہ ہے !

میں اس کو کس طرح سوچ پاؤں
کہ میری آنکھوں کی پُتلیوں میں
سوائے حیرت کے کچھ نہیں ہے !
کہ میری بے صرفہ مٹھیوں میں
سوائے حسرت کے کچھ نہیں ہے !
جو چُھونا چاہوں تو چُھو نہ پاؤں
زباں پہ جب اُس کا نام لاؤں
تو ذائقے کی لُغت میں لکھے تمام الفاظ بھول جاؤں
میں نیم شب کی گھنی اُداسی میں اپنے سائے کے رُوبرو ہوں
اور اُس کو آواز دے رہا ہوں
جو صَوت و آہنگ کے وسیلوں سے ماورا ہے
جو میری بے سمت خواہشوں کا قطب نما ہے

کبھی کبھی جب مری صدائیں ،
گھروں سے بچھڑی یہ فاختائیں،
(جو کہکشاؤں کے راستے پہ رواں ہوئی تھیں)
مرے زمان و مکاں سے آگے
مرے تخیل سے اور میرے گماں سے آگے
حدودِ حدِّ بیاں سے آگے کی وسعتوں سے پلٹ کے آتی ہیں
اور میرے لہو کی وادی میں گونجتی ہیں
میں سوچتا ہوں
میں اپنے ہونے کے اور نہ ہونے کے مخمصے میں یہ سوچتا ہوں
یہ میرے چاروں طرف جو بکھری ہوئی خلا ہے !
میں اِس کے اندر ہوں ؟
اس سے باہر ہوں ؟
اِس کا حصّہ ہوں ؟
یا کہ کیا ہے ؟ ؟

نعت

اُداسی کے سفر میں جب ہوا رُک رُک کے چلتی ہے
سوادِ ہجر میں ہر آرزو چپ چاپ جلتی ہے
کسی نادیدہ غم کا کہر میں لپٹا ہوا سایا

زمیں تا آسماں پھیلا ہوا محسوس ہوتا ہے
گزرتا وقت بھی ٹھہرا ہوا محسوس ہوتا ہے

تو ایسے میں تری خوشبو،
محمدؐ مصطفےٰ، صَلِّ علیٰ کے نام کی خوشبو
دلِ وحشت زدہ کے ہاتھ پر یوں ہاتھ رکھتی ہے
تھکن کا کوہِ غم ہٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے
سفر کا راستہ کٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے

خزاں کے آخری دن تھے

خزاں کے آخری دن تھے
بہار آئی نہ تھی لیکن
ہوا کے لمس میں اک بے صدا سی نغمگی
محسوس ہوتی تھی
درختوں کے تحیّر میں
کسی بے آسرا اُمید کی لَو تھرتھراتی تھی
گزرگاہوں میں اُڑتے خشک پتّے
اجنبی لوگوں کے قدموں سے لپٹتے اور اُلجھتے تھے
تو اک بھولی ہُوئی تصویر جیسے کوند جاتی تھی ،

ہر اک منظر کے چہرے پر
لرزتی بے کلی کی ریشمیں چلمن کشیدہ تھی
نظر رستہ نہ پاتی تھی

کچھ ایسا ہی سماں تھا جب
وہ میرے بخت کے صحرا میں ساون کی طرح اُتری
مرے سانسوں میں مہکی تھی
نگاہوں کے ستارے، آرزو کے استعارے تھے،
تمنّاؤں کے سیلِ شوق میں بہنے لگی تھی وہ
مرے سینے پہ سر رکھ کر اچانک مسکرائی
اور کچھ کہنے لگی تھی وہ . . .

نہ جانے کیا تھا وہ جُملہ!
وہ اُس کا ادھ کہا جُملہ،
جو غنچے کی طرح اُن کانپتے ہونٹوں پہ پھُوٹا تھا
اُسی لمحے کوئی کوئل بڑے ہی درد سے کُوکی تھی
وہ جیسے، اچانک نیند سے جاگی تھی
اور اُس نے بڑے دُکھ سے فلک کی سمت دیکھا تھا

وہ بولی تھی ....

"ستارہ شام کا روشن ہوا ہے، اب میں چلتی ہوں!"

خزاں کے آخری دن ہیں
ہوا کے لمس میں اک بے صدا سی نغمگی محسوس ہوتی ہے
کوئی مانوس سی خوشبو مرے کانوں میں کہتی ہے،
"پھر اُس کے حُسن کا محرم ترا دل ہونے والا ہے
وہ اُس کا ادھ کہا جُملہ
مکمّل ہونے والا ہے!"

زنجیر

ریت کی لوح پہ لکھے ہوئے دریا کی طرح
یہ جو ہر راہ کے ہمراہ چلی آتی ہے
کیسی دیوار ہے یہ؟
از ازل تا بہ ابد
خواب اور خواب کی تعبیر کے مابین جو یہ
بھاگتے وقت کی تلوار سی لہراتی ہے
کیسی تلوار ہے یہ؟
یہ جو ہر موڑ پہ رکتے ہوئے رستے کی طرح
ڈولتے پاؤں کی زنجیر بنی جاتی ہے
کیسی رفتار ہے یہ؟

لفظ کی راہ میں، معنی کی گزرگاہوں میں
کون سے سچ کو چھپانے کے لیے
جھوٹ اسٹیج کے پردے کی طرح حائل ہے
یہ بھی معلوم نہیں
کون ناظر ہے یہاں اور تماشا کیا ہے ؟

ریت کی لوح پہ لکھے ہوئے دریا کی طرح
از اُفق تا بہ اُفق
شک کی دیوار چلی جاتی ہے
شک کی دیوار کے اُس پار کا منظر کیا ہے ؟
کون بتلائے مجھے !
بات کا روپ ہے کیا، بات کے اندر کیا ہے ؟

○

تُو نہیں، تیرا استعارا نہیں
آسماں پر کوئی ستارا نہیں

وہ مرے سامنے سے گزرا تھا!
پھر بھی میں چُپ رہا، پکارا نہیں

وہ نہیں ملتا ایک بار ہمیں
اور یہ زندگی دوبارا نہیں

ہر سمندر کا ایک ساحل ہے
ہجر کی رات کا کنارا نہیں

ہو سکے تو نگاہ کر لینا
تم پہ کچھ زور تو ہمارا نہیں

ناؤ اُلٹی تو یہ ہوا معلوم
زندگی موج ہے، کنارا نہیں!

○

مرنے کا ترے غم میں ارادہ بھی نہیں ہے
ہے عشق مگر اِتنا زیادہ بھی نہیں ہے

ہے یوں کہ عبارت کی زباں اور ہے کوئی
کاغذ مری تقدیر کا سادا بھی نہیں ہے

کیوں دیکھتے رہتے ہیں ستاروں کی طرف ہم!
جب اُن سے ملاقات کا وعدہ بھی نہیں ہے

کیوں راہ کے منظر میں اُلجھ جاتی ہیں آنکھیں!
جب دل میں کوئی اور ارادہ بھی نہیں ہے

۲۸

کیوں اُس کی طرف دیکھ کے پاؤں نہیں اُٹھتے
وہ شخص حسیں اِتنا زیادہ بھی نہیں ہے

کس موڑ پہ لے آیا ہمیں، ہجرِ مسلسل !
تا حدِّ نگہ وصل کا وعدہ بھی نہیں ہے

پتّھر کی طرح سرد ہے کیوں آنکھ کسی کی !
امجدؔ جو بچھڑنے کا ارادہ بھی نہیں ہے

رحمان بابا کے لیے ایک نظم

وہ نیم شب کی گھنی اُداسی میں اپنے سائے کے رُوبرو تھا
اور ایک حیرت کا شامیانہ سا چار سُو تھا

یہی وہ حیرت،
یہی وہ ہستی شکار حیرت
تھی جس کی لشکوں سے
اُس کے لفظوں کے بخت جاگے،
پہاڑ جھمکے، گلاب چمکے، درخت جاگے!

وہ وادیوں کی گھنی اُداسی میں
چُپ کی آواز سُننے والا
وہ اَن لکھے لفظ پڑھنے والا
وہ اَن بہے اشک چننے والا
وہ میری ارضِ وطن کا شاعر
جو اپنے لفظوں میں جی رہا ہے
وہ اُس کے گیتوں کا تھا مسافر
ہر اک سفر کا جو منتہا ہے
میں جس تحیّر کی راہ میں ہوں
وہ اُس کی منزل سے آشنا ہے

———

ذرا سی بات

زندگی کے میلے ہیں، خواہشوں کے ریلے ہیں
تم سے کیا کہیں جاناں، اس قدر جھمیلے ہیں
وقت کی روانی ہے، بخت کی گرانی ہے
سخت بے زمینی ہے، سخت لامکانی ہے
ہجر کے سمندر میں
تخت اور تختے کی ایک ہی کہانی ہے
تم کو جو سنانی ہے
بات گو ذرا سی ہے
بات عمر بھر کی ہے
(عمر بھر کی باتیں کب دو گھڑی میں ہوتی ہیں!
درد کے سمندر میں
ان گنت جزیرے ہیں، بے شمار موتی ہیں)

آنکھ کے دریچے میں تم نے جو سجایا تھا
بات اُس دیئے کی ہے
بات اُس گلے کی ہے
جو لہو کی خلوت میں چور بن کے آتا ہے
لفظ کی فصیلوں پر ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے
زندگی سے لمبی ہے، بات رت جگے کی ہے
راستے میں کیسے ہو!
بات تخلیئے کی ہے
تخلیئے کی باتوں میں گفتگو اضافی ہے
پیار کرنے والوں کو اک نگاہ کافی ہے
ہو سکے تو سُن جاؤ ایک دن اکیلے میں
تم سے کیا کہیں جاناں، اس قدر جھمیلے ہیں

O

دُور تلک ویرانہ ہے
کب تک چلتے جانا ہے
آئینے کے ہاتھوں میں
مقتل کا پروانہ ہے
جانے والو، یاد رہے
شام ڈھلے گھر جانا ہے
فرق ہے کچھ کرداروں میں
باقی کھیل پرانا ہے
سچی باتیں کون کرے
کون یہاں دیوانہ ہے
تجھ سا دُوجا دیکھنے کو
سارا عالم چھانا ہے
مٹی بھی ہے، سونا بھی
دل بھی عجب خزانہ ہے

محبّت

محبّت اوس کی صورت ،
پیاسی پنکھڑی کے ہونٹ کو سیراب کرتی ہے
گُلوں کی آستینوں میں انوکھے رنگ بھرتی ہے
سحر کے جھٹپٹے میں ، گنگناتی ، مسکراتی ، جگمگاتی ہے
محبّت کے دنوں میں دشت بھی محسوس ہوتا ہے
کسی فردوس کی صورت
محبّت اوس کی صورت !

محبّت ابر کی صورت

دلوں کی سرزمیں پہ گھر کے آتی اور برستی ہے
چمن کا ذرّہ ذرّہ جھومتا ہے، مسکراتا ہے
ازل کی بے نمو مٹی میں سبزہ سر اُٹھاتا ہے
محبّت اُن کو بھی آباد اور شاداب کرتی ہے
جو دل ہیں قبر کی صُورت
محبّت ابر کی صُورت!

محبّت آگ کی صُورت،

بُجھے سینوں میں جلتی ہے تو دل بیدار ہوتے ہیں
محبّت کی تپش میں کچھ عجب اسرار ہوتے ہیں
کہ جتنا یہ بھڑکتی ہے، عروسِ جاں مہکتی ہے
دلوں کے ساحلوں پر جمع ہوتی اور بکھرتی ہے
محبّت، جھاگ کی صُورت
محبّت، آگ کی صُورت!

محبّت خواب کی صُورت،
نگاہوں میں اُترتی ہے کسی مہتاب کی صُورت
ستارے آرزو کے اس طرح سے جگمگاتے ہیں
کہ پہچانی نہیں جاتی دلِ بے تاب کی صُورت!
محبّت کے شجر پر خواب کے پنچھی اُترتے ہیں
تو شاخیں جاگ اُٹھتی ہیں
تھکے ہارے ستارے جب زمیں سے بات کرتے ہیں
تو کب کی منتظر آنکھوں میں
شمعیں جاگ اُٹھتی ہیں
محبّت اِن میں جلتی ہے چراغِ آب کی صورت
محبّت، خواب کی صورت!

محبّت درد کی صُورت
گزشتہ موسموں کا استعارہ بن کے رہتی ہے
شبانِ ہجر میں، روشن ستارہ بن کے رہتی ہے
منڈیروں پر چراغوں کی لَویں جب تھرتھراتی ہیں

نگر میں نااُمیدی کی ہوائیں سنسناتی ہیں
گلی میں جب کوئی آہٹ، کوئی سایہ نہیں رہتا
دُکھے دل کے لیے جب کوئی بھی دھوکہ نہیں رہتا
غموں کے بوجھ سے جب ٹوٹنے لگتے ہیں شانے تو
یہ اُن پہ ہاتھ رکھتی ہے
کسی ہمدرد کی صورت!
گزر جاتے ہیں سارے قافلے جب دل کی بستی سے
فضا میں تیرتی ہے دیر تک
یہ گرد کی صورت،
محبت، درد کی صورت!

○

مقتل میں بھی اہلِ جنوں ہیں کیسے غزل خواں ، دیکھو تو!
ہم پہ پتھر پھینکنے والو ، اپنے گریباں، دیکھو تو !

ہم بھی اُڑائیں خاکِ بیاباں، دشت سے نم گزرو تو سہی
ہم بھی دکھائیں چاکِ گریباں ، لیکن جاناں، دیکھو تو !

اے تعبیریں کرنے والو ، ہستی مانا خواب سہی
اس کی رات میں جاگو تو ، یہ خوابِ پریشاں دیکھو تو!

آج ستارے گُم صُم ہیں کیوں، چاند ہے کیوں سودائی سا
آئنے سے بات کرو، اس بھید کا عنواں دیکھو تو!

کس کے حُسن کی بستی ہے یہ! کس کے روپ کا میلہ ہے!
آنکھ اُٹھا اے خوابِ زلیخا ، یوسفِ کنعاں، دیکھو تو!

جو بھی علاجِ درد کرو ، میں حاضر ہوں، منظور مجھے
لیکن اک شب امجد جی ، وہ چہرۂ تاباں، دیکھو تو

مجھے اپنا ستارا ڈھونڈنا ہے

ستارا ڈھونڈنا ہے
ستاروں سے بھرے اِس آسماں کی وسعتوں میں
مجھے اپنا ستارا ڈھونڈنا ہے

فلک پر کہکشاں در کہکشاں اک بے کرانی ہے
نہ اُس کا نام ہے معلوم، ناں کوئی نشانی ہے

بس اتنا یاد ہے مجھ کو
ازل کی صبح جب سارے ستارے
الوداعی گفتگو کرتے ہوئے رستوں پہ نکلے تھے

تو اُس کی آنکھ میں اِک اور تارا جھلملایا تھا
اُسی تارے کی صورت کا
مری بھیگی ہوئی آنکھوں میں بھی اک خواب رہنا ہے
میں اپنے آنسوؤں میں اپنے خوابوں کو سجاتا ہوں
اور اُس کی راہ تکتا ہوں
سُنا ہے گمشدہ چیزیں
جہاں پہ کھوئی جاتی ہیں
وہیں سے مل بھی جاتی ہیں

مجھے اپنا ستارا ڈھونڈنا ہے!

اے دُنیا

اے دُنیا، ہم کب تک تیرے ساتھ چلیں!
جو موزوں پیمانہ دیکھیں اُس میں ڈھلتے جائیں
چہرہ بدلیں، لہجہ بدلیں، آنکھ بدلتے جائیں!
کب تک ہم اس جھُوٹ نگر میں یُونہی چلتے جائیں

اندر کی اِس آگ میں کتنا اور جلیں!
اے دُنیا ہم کب تک تیرے ساتھ چلیں!
اپنے شک کی دیواروں کے نیچے بیٹھے ہیں
دیکھ رہے ہیں، پھر بھی، آنکھیں میچے بیٹھے ہیں
دوست ہمارے ہر جھاڑی کے پیچھے بیٹھے ہیں

اِک دُوجے کے خُون پہ کتنا اور پلیں !
اے دُنیا ہم کب تک تیرے ساتھ چلیں !

اے دُنیا تُو چار طرف ہے تیرے رُوپ ہزار
جو بھی بھاگے، جتنا بھاگے! تجھ سے نہیں فرار
آپ مریں یا تجھ کو ماریں، دونوں ہیں دشوار
کب تک ہم پچھتائیں، کب تک ہاتھ ملیں!
اے دُنیا ہم کب تک تیرے ساتھ چلیں!

ماہیے

جگنو کہ ستارا تھا
ترے بام پہ جو چمکا
وہی نام ہمارا تھا

دریاؤں کے دھارے ہیں
تم مانو کہ نہ مانو
ہم دل سے تمھارے ہیں

پھولوں کی کیاری ہے
ترے دل کی خوشی سجنا
ہمیں جان سے پیاری ہے

قصّے نہیں دوہراتے
جو لمحے گزر جائیں
وہ مُڑ کے نہیں آتے

دُنیا مرے ساتھ چلے
ہر چیز ٹھہر جائے
جب تم سے بات چلے

تکرار نہیں کرتے
جب ساجن بات کرے
انکار نہیں کرتے

ازلوں سے باندی ہوں
جو مرضی صاحب کی
میں اُس کی باندی ہوں

بہتا ہُوا ساگر ہیں
تک ایک نظر سائیں
دو پَل کے مسافر ہیں

آواز کا صحرا ہے
یہ زخم جدائی کا
دریاؤں سے گہرا ہے

کچھ کام تو کر جائیں
تری چاہ میں زندہ ہیں
تری راہ میں مر جائیں

اِک بھول نہ ہو جائیں
تری ڈاچی کے مُڑنے تک
ہم دُھول نہ ہو جائیں

سوچوں، گھبراؤں میں
کچھ بھی تو نہیں پلّے
کیسے یار مناؤں میں

نذرِ وطن ــ کچھ ماہیے

اک خواب سفر میں ہے
پھولوں میں نہیں اُترا
جو رنگ شجر میں ہے

رحمت کا اشارا ہے
اس گھور اندھیرے میں
اُمید کا تارا ہے

پھر بات نہیں چلتی
جو پیڑ سے کٹ جائے
وہ شاخ نہیں پھلتی

اب فرض حفاظت ہے
یہ پاک وطن ساتھی
اللہ کی امانت ہے

اک باغ بنے ایسا
ہو خاک کے تختے پر
کوئی اور نہ اُس جیسا

ہم تاج یہ ہیرا ہے
دُنیا کے سمندر میں
یہ مُلک جزیرہ ہے

باغوں میں کِھلیں کلیاں
رہیں روزِ قیامت تک
آباد تری گلیاں!

کھیتوں میں ستارے ہیں
ہر شاخ کی آنکھوں میں
ارمان ہمارے ہیں

تقدیر نہیں بنتی
جب خواب اُدھورا ہو
تعبیر نہیں بنتی

یہ خواب رہے زندہ
ہے آج بھی یہ روشن
کل اور ہو تابندہ

گلزار بنا دیں گے
اس چاند زمیں کو ہم
تاروں سے سجا دیں گے

پہچان ہماری ہے
یہ پاک زمیں یارو
رجند جان ہماری ہے

کرنوں کے اشارے ہیں
یہ چاند ہمارا ہے
ہم اس کے ستارے ہیں

اِک چاند، اِک تارا ہے
لہراتا ہوا پرچم
اعلان ہمارا ہے

تعمیر کی صورت ہے
اس دیس کا ہر بچہ
تعبیر کی صورت ہے

ابھی کچھ دنوں میں

ابھی کچھ دنوں میں
مری عمر کی اک دہائی ، یہ چوتھی دہائی
گزشتہ دہائیوں کی مانند فردا سے
اُبھرے گی اور راکھ ہو جائے گی
وقت کے دشتِ حیرت میں کھو جائے گی ۔

شب و روز کے اس تسلسل میں چالیس برسوں
پہ پھیلے ہوئے خواب مجھ سے پتہ پوچھتے ہیں

خود اپنے ہی چھوڑے ہوئے راستوں کا!
سُلگتے ہوئے بے صدارت جگنوں کا
بھٹکتی ہوئی بے ثمر بارشوں کا !
لہو میں مچلتی ہوئی خواہشوں کا

وہ لمحے، جو غم کی کمانوں سے چھُوٹے تو سیدھے دلوں میں ترازو ہوئے!
وہ لمحے، جو زلفوں کی چھاؤں میں گزرے تو ہر آس کے دست و بازو ہوئے!
وہ لمحے، جنھیں بھُول جانے کی خاطر میں اَن دیکھے رستوں پہ چلتا رہا
وہ لمحے، جنھیں دیکھنے کے لیے میں چراغوں کی مانند جلتا رہا
جمع و تفریق کے اس مسلسل عمل میں
جو لمحہ بھی گزرے پلٹتا نہیں
وقت کے آئنے میں کوئی عکس بھی
ایک پل سے زیادہ ٹھہرتا نہیں

(۲)

وقت شطرنج ہے!
جس کی چالوں کو گننا، ستاروں کے گننے سے کمتر نہیں

اور ہمارا سفر — یہ ازل سے ابد تک کا سارا سفر!
انہی چند خانوں کی گردش میں ہے، ان سے باہر نہیں!

(۳)

عمر کی جس دہائی کی سرحد پہ میں ہوں
وہاں پر زمانے!
کمانوں سے چھوٹے، بھٹکتے ہوئے تیر جیسے زمانے!
بس اک پل کو رکتے ہیں
آپس میں ملتے ہیں
اک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں...،
مگر اس سے پہلے کہ کچھ بول پائیں
اُون کے اِس اُلجھتے ہوئے ڈھیر کا اِک سرا کھول پائیں
ملاقات کی مہلتِ یک نفس ختم ہوتی ہے
اور زندگی
جیل کے وارڈن کی طرح اِن زمانوں کو پھر
بیرکوں کے اندھیرے میں لے جاتی ہے

وقت کی بیڑیں

جن میں ماضی بھی ہے اور آئندہ بھی ___ حال کوئی نہیں
ایک پُل کی طرح
عمر کے اس سمندر پہ ٹھہرا ہوا کوئی لمحہ نہیں ___ سال کوئی نہیں
ابھی کچھ دنوں میں مری عمر کی یہ دہائی بھی گزری دہائیوں کی مانند
فردا سے اُبھرے گی اور راکھ ہو جائے گی
وقت کے دشتِ حیرت میں کھو جائے گی!
ابھی کچھ دنوں میں . . ،
ابھی کچھ دنوں میں ؎

○
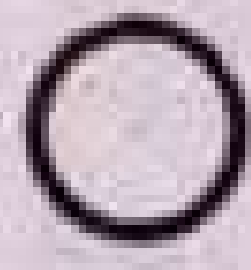
کس رات کی آنکھوں میں پیمانِ سحر ہوگا
یہ خواب جو کونپل ہے، کس رُت میں شجر ہوگا

آنچل کی ہوا رکھنا، لَو اس کی بچا رکھنا
یہ شمع جدھر ہوگی، پروانہ اُدھر ہوگا

جب رات کے پردے سے پھر رات نکل آئے
اُس وقت کدھر جائے، جو اہلِ نظر ہوگا

تاریخ کے چکّر میں وہ موڑ نہیں آتا
جب شاد مکیں ہوں گے، آباد نگر ہوگا

بجھتے ہوئے تاروں کی جھلمل بھی غنیمت ہے
اس ٹھہری ہوئی شب میں کچھ وہمِ سفر ہوگا

افکار پہ پہرا ہے، قانون یہ ٹھہرا ہے
جو صاحبِ عزّت ہے وہ شہر بدر ہوگا

محسوس یہ ہوتا ہے، ہر جلتا ہوا تارا
گزرے ہوئے وقتوں میں اک زخمِ ہُنر ہوگا

سہمے ہوئے پنچھی کی آواز بتاتی ہے!
اُس کا بھی یہیں کوئی، جلتا ہوا گھر ہوگا

اِس بھید بھری چُپ میں

اے شمعِ کوئے جاناں ،
ہے تیز ہَوا ، مانا
تُو اپنی بچار رکھنا ۔ رستوں پہ نگہ رکھنا

ایسی ہی کسی شب میں
آئے گا یہاں کوئی ، کچھ زخم دکھانے کو
اِک ٹوٹا ہوا وعدہ ، مٹی سے اُٹھانے کو

پیروں پہ لہو اُس کے
آنکھوں میں دُھواں ہو گا
چہرے کی دراڑوں میں
بیتے ہوئے برسوں کا
ایک ایک نشاں ہو گا
بولے گا نہ کچھ لیکن ، فریاد کُناں ہو گا

اے شمعِ کوئے جاناں

وہ خاک بسر راہی — وہ سوختہ پروانہ
جب آئے یہاں اُس کو مایوس نہ لوٹانا!
ہو تیز ہوا کتنی، لَو اپنی بچا رکھنا
رستوں پہ نگہ رکھنا — راہی کا پتا رکھنا،

اِس بھید بھری چُپ میں اک پھُول نے کھلنا ہے!
اُس نے انہی گلیوں میں، اِک شخص سے ملنا ہے!!

○

کون سی چیز دل کے بس میں نہیں
دل مگر اپنی دسترس میں نہیں

یہ تو ہم ہیں، جو خار و خس میں ہیں
منزلِ گل تو خار و خس میں نہیں!

کب سے آنکھیں تلاشتی ہیں اُسے
ایک دن، جو کسی برس میں نہیں

جسم کتنی بڑی حقیقت ہو!
دل کی تسکیں مگر ہوس میں نہیں

کامراں، عاشقی کی منزل میں
ہے وہی دل جو پیش و پس میں نہیں

دیکھ لی جنتری زمانے کی
وصل کا دن کسی برس میں نہیں

(ق)

نارسائی کی دھند کے اُس پار
عشق میں کیا ہے، جو ہوس میں نہیں!

لذتِ پَر کشادگی کے سوا!
باغ میں کیا ہے، جو قفس میں نہیں!

○

پیڑ کو دیمک لگ جائے یا آدم زاد کو غم
دونوں ہی کو امجدؔ ہم نے بچتے دیکھا کم

تاریکی کے ہاتھ پہ بیعت کرنے والوں کا
سُورج کی بس ایک کِرن سے گُھٹ جاتا ہے دَم

رنگوں کو کلیوں میں جینا کون سکھاتا ہے!
شبنم کیسے رُکنا سیکھی! تتلی کیسے رَم!

آنکھوں میں یہ پلنے والے خواب نہ بجھنے پائیں،
دل کے چاند چراغ کی دیکھو، لَو نہ ہو مدّھم

ہنس پڑتا ہے بہت زیادہ غم میں بھی انساں
بہت خوشی سے بھی تو آنکھیں ہو جاتی ہیں نم!

———

عُمر کی سیڑھیاں

ہاں، سنو دوستو!
جو بھی دُنیا کہے
اُس کو پرکھے بِنا، مان لینا نہیں۔
ساری دُنیا یہ کہتی ہے،
پربت پہ چڑھنے کی نسبت اُترنا بہت سہل ہے
کس طرح مان لیں،
تُم نے دیکھا نہیں!
سرفرازی کی دُھن میں کوئی آدمی
جب بلندی کے رستے پہ چلتا ہے تو
سانس تک ٹھیک کرنے کو رُکتا نہیں
اور اُسی شخص کا
عُمر کی سیڑھیوں سے اُترتے ہوئے
پاؤں اُٹھتا نہیں!
اس لیے دوستو، جو بھی دنیا کہے
اُس کو پرکھے بِنا، مان لینا نہیں۔

ساری دُنیا یہ کہتی ہے
اصل سفر تو مسافر کی آنکھوں میں پھیلا ہوا خواب ہے

کس طرح مان لیں ،
تم نے دیکھا نہیں ،
عمر کے اس سرابِ اجل خیز میں
خواب تو خواب ہیں
ہم کھُلی آنکھ سے جو بھی کچھ دیکھتے ہیں
وہ ہوتا نہیں

راستے کے لیے (راستے کی طرح)
آدمی اپنے خوابوں کو بھی کاٹ دیتے ہیں لیکن
سُلگتا ہوا راستہ
پھر بھی کٹتا نہیں !
اس لیے دوستو
جو بھی دنیا کہے
اُس کو پرکھے بِنا ، مان لینا نہیں ۔

○

ملے کیسے صدیوں کی پیاس اور پانی ، ذرا پھر سے کہنا
بڑی دِلربا ہے یہ ساری کہانی ، ذرا پھر سے کہنا

کہاں سے چلا تھا جُدائی کا سایا ، نہیں دیکھ پایا
کہ رستے میں تھی آنسوؤں کی روانی ، ذرا پھر سے کہنا

ہَوا یہ خبر تُو سناتی رہے اور میں سُنتا رہوں
بدلنے کو ہے اب یہ موسم خزانی ، ذرا پھر سے کہنا

مُکر جانے والا کبھی زندگی میں ، خوشی پھر نہ پائے !
یونہی ختم کرلیں ، چلو یہ کہانی ، ذرا پھر سے کہنا

سمے کے سمندر ! کہا تُو نے جو بھی ، سُنا ، پر نہ سمجھے
جوانی کی ندّی ، ہیں تھا تیز پانی ، ذرا پھر سے کہنا

آج

یہ "آج" جو کل میں زندہ تھا
وہ "کل" جو آج میں زندہ ہے
وہ "کل" جو "کل" کے ساتھ گیا
وہ "کل" جو ابھی آئندہ ہے
گزر چکے اور آنے والے، جتنے "کل" ہیں، جتنے "کل" تھے!
ان کا کوئی وجود نہ ہوتا
ہم اور تم بے اسم ہی رہتے
"آج" اگر موجود نہ ہوتا
ممکن ہے "آیندہ" صرف اِک خواب ہو جس کی
تعبیروں میں جینے والی ساری آنکھیں ڈوب چکی ہوں!
(لیکن وہ خود بجھ کر بھی رخشندہ ہو!)
ہو سکتا ہے
"رفتہ" کی دہلیز پہ ٹھہری
بھید بھری اس آنکھ کے اندر

چُھپا ہوا آئندہ ہو!

"آئندہ" کے مُنہ پہ پڑی یہ غیب کی چادر
اُٹھ جائے تو ہو سکتا ہے
اس میں ہمارا اور تمھارا
ایک اِک لمحہ زندہ ہو
(روشن اور تابندہ ہو!)
لیکن یہ بھی دھیان میں رکھنا
ہو سکتا ہے آنے والے کل میں ہمارا "آج" نہ ہو
اور اُس کی جگہ
اک ایسے وقت کا سایہ سا رقصندہ ہو، جو
ماضی، حال اور مستقبل کے
تین کناروں والے اس دریا سے یکسر باہر ہو
(اور کہیں سے جنم ہوا اس کا — اور کہیں پہ ظاہر ہو!)

ماضی، حال اور مستقبل،
تین کناروں والے اس دریا کے اندر
اپنی اپنی موجیں مارتے چلتے ہیں

پھر اُس لہر میں ڈھلتے ہیں
جو صبحِ ازل کو اچھلی تھی اور اب تک کہیں معلّق ہے !
اُسی معلّق لہر کے بے خود قطرے ہیں ہم ،
ہم اور ہم سے اربوں ، کھربوں
(گزر چکے اور آنے والے)
سو، اے وقت کی حیرت میں کھو جانے والی آنکھ — ٹھہر !

" آج " کے پُل پر رک کر آگے پیچھے دیکھ
روشنی اور تاریکی شاید، ایک ہی ڈال کے پتّے ہیں !
لمحوں کا یہ فرق نظر کا دھوکہ ہے ،
وقت کی اِس " ناوقتی " کے سیلاب میں — شاید !
" آج " ہی واحد لمحہ ہے !!
عمرِ رواں کی دہشت میں کھو جانے والی آنکھ — ٹھہر !

———

○

گزرے ہیں ترے بعد بھی کچھ لوگ اِدھر سے
لیکن تری خوشبو نہ گئی، راہ گزر سے

کیوں ڈوبتی، بجھتی ہوئی آنکھوں میں ہے روشن
راتوں کو شکایت ہے تو اتنی ہے سحر سے!

لرزا تھا بدن اُس کا مرے ہاتھ سے چھُو کر
دیکھا تھا مجھے اُس نے عجب مست نظر سے

کیا ٹھان کے نکلا تھا، کہاں آ کے پڑا ہے!
پوچھے تو کوئی اس دلِ شرمندہ سفر سے

آیا ہے بہت دیر میں وہ شخص، پر اُس کو
جذبات کی اِس بھیڑ میں دیکھوں مَیں کدھر سے

ہم رزقِ گزرگاہ تو خاشاک تھے، لیکن!
وہ لوگ، جو نکلے تھے ہوا دیکھ کے گھر سے!

ایسا تو نہیں، میری طرح سروِ لبِ جُو!
قدموں پہ کھڑا ہو کسی اُفتاد کے ڈر سے

دن تھے کہ ہمیں شہرِ بدن تک کی خبر تھی
اور اب نہیں آگاہ تری خیر خبر سے

امجدؔ نہ قدم روک کہ وہ دُور کی منزل
نکلے گی کسی روز اسی گردِ سفر سے

○
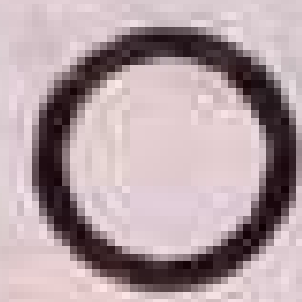
دریا کی ہوا تیز تھی، کشتی تھی پرانی
روکا تو بہت، دل نے مگر ایک نہ مانی

میں بھیگتی آنکھوں سے اُسے کیسے ہٹاؤں
مشکل ہے بہت ابر میں دیوار اُٹھانی

نکلا تھا تجھے ڈھونڈنے اک ہجر کا تارا
پھر اُس کے تعاقب میں گئی، ساری جوانی

کہنے کو نئی بات کوئی ہو تو سنائیں
سو بار زمانے نے سنی ہے یہ کہانی!

یہ پُل ہے یہاں پھُول کہاں، پچھلے برس کے
ہے دن تو وہی دوست، مگر اور ہے پانی

کس طرح مجھے ہوتا گماں، ترکِ وفا کا
آواز میں ٹھہراؤ تھا، لہجے میں روانی

اب میں اُسے قاتل کہوں امجدؔ کہ مسیحا
کیا زخمِ ہنر چھوڑ گیا، اپنی نشانی!

○
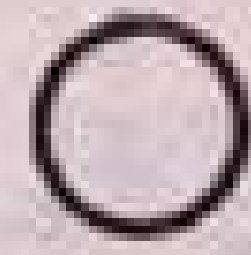
تری زد سے نکلنا چاہتا ہے
یہ دریا رُخ بدلنا چاہتا ہے

وہ سپنا، جس کی صورت ہی نہیں ہے
مری آنکھوں میں پلنا چاہتا ہے

دلوں کی ماندگی پہ کیا تعجب!
کہ سُورج بھی تو ڈھلنا چاہتا ہے

نشستِ درد بدلی ہے تو اب دل
ذرا پہلو بدلنا چاہتا ہے

ہَوا ہے بند اور شعلہ وفا کا
بہت ہی تیز جلنا چاہتا ہے

یہ دل اِس گردبادِ زندگی میں
بس اِک لمحہ سنبھلنا چاہتا ہے

مجھے بھی سامنا ہے کربلا کا
مرا سر بھی اُچھلنا چاہتا ہے

نہیں ہیں ترجمانِ غم، یہ آنسو
یہ پانی اب اُبلنا چاہتا ہے

گزشتہ صحبتوں کا ایک لشکر
مرے ہمراہ چلنا چاہتا ہے

اُن آنکھوں کی ادا کہتی ہے امجد
کوئی پتّھر پگھلنا چاہتا ہے

○

چھیڑیں گے وہی قصّۂ غم اور طرح سے
لائیں گے تجھے راہ پہ ہم اور طرح سے

سجدے میں جبیں، سینے میں پندارِ خدائی!
اب آئے ہیں کعبے میں صنم اور طرح سے

ہوتا ہے گماں ان پہ کسی دستِ طلب کا
اب کھولے ہیں یاروں نے عَلَم اور طرح سے

ہے کام مساواتِ محمّد کو مٹانا
کرتا ہے عرب اور، عجم اور طرح سے

ہم سوچتے رہتے ہیں عطا اور طرح کی
دیتا ہے ترا دستِ کرم اور طرح سے

مرتے تو شہیدانِ محبّت بھی ہیں امجد
جاتے ہیں مگر سوئے عدم اور طرح سے

○

چہرے پہ مرے زُلف کو پھیلاؤ کسی دن
کیا روز گرجتے ہو، برس جاؤ کسی دن
رازوں کی طرح اُترو مرے دل میں کسی شب
دستک پہ مرے ہاتھ کی کُھل جاؤ، کسی دن
پیڑوں کی طرح حُسن کی بارش میں نہاؤں
بادل کی طرح جھُوم کے گِھر آؤ کسی دن
خُوشبو کی طرح گزرو مرے دل کی گلی سے
پھُولوں کی طرح مجھ پہ بکھر جاؤ کسی دن
پھر ہاتھ کو خیرات ملے بندِ قبا کی
پھر لطفِ شبِ وصل کو دوہراؤ کسی دن
گزریں جو مرے گھر سے تو رُک جائیں ستارے
اِس طرح مری رات کو چمکاؤ کسی دن
میں اپنی ہر اک سانس اُسی رات کو دے دوں
سر رکھ کے مرے سینے پہ سو جاؤ، کسی دن

سپنے کیسے بات کریں

سپنے کیسے بات کریں!
خدشوں کی زنجیر پڑی ہے نیند بھری سب آنکھوں میں
سپنے کیسے بات کریں!
سپنے کس سے بات کریں!
جن لوگوں کا رستہ تکتے عمریں رزقِ خاک ہوئیں
اب وہ لوگ اور اُن کے سپنے دیکھنے والی
آنکھیں بجھ کر راکھ ہوئیں
راکھ کے اس انبار میں ہوں گے کیسے کیسے زندہ خواب!
خوابوں کی اس راکھ کو لیکن چھیڑے کون؟

جس رستے پر چھاؤں نہ پانی
اُس پر ڈالے ڈیرے کون؟
جس مٹی میں ریت ملی ہو
اُس میں کیسے باغ لگائیں!
دریا ہی پایاب ہو جب تو
اس میں کشتی کیا لے جائیں!

خوشبو ایک آوارہ جھونکا، اس جھونکے کو گھیرے کون!
کیسے دنیا کو بتلاؤں، تم ہوتے ہو میرے کون!!

منظر — پس منظر

کاسہ ہے گدائی کا درویش کا پیالہ بھی
مانگے کی ضیا لے کر یہ چاند ہوا روشن
یہ چاند ہوا روشن اور چاند کا ہالہ بھی

امروز کا پردا ہو، ماضی ہو کہ فردا ہو!
اک بھید انوکھا ہے، اک راز یہ گہرا ہے!
اس برف کی گھاٹی پہ کچھ دیر کو ٹھہرا ہے
خوابوں کا اُجالا بھی، دن رات کا جالا بھی
یہ بجھتا ہوا منظر اور دیکھنے والا بھی!

خواب اور خدشے

جاگتے میں بھی سوتی ہیں،
کچھ آنکھیں ایسی ہوتی ہیں!
بے موسم کلیوں کی صورت ہولے ہولے کھلتی ہیں
دنیا کی اس بھیڑ میں یونہی اک لمحے کو ملتی ہیں،
محفل محفل گھومنے والے
لوگ اکیلے ہو جاتے ہیں
ان آنکھوں کی کھوج میں اکثر
اپنے آپ کو کھو جاتے ہیں
میں نے بھی دیکھی تھیں اک دن
ایسی ہی دو مشکل آنکھیں
ہلکی سبز اور بوجھل آنکھیں
یوں تو اب تک جتنی گزری خوش چشموں میں گزری ہے
لیکن ایسے گہرے ساگر!
لیکن ایسی ساحل آنکھیں!!

یوں لگتا تھا جیسے میری رُوح میں رستہ بن جائے گا
یا پھر اک بے نام سا پردا ہر منظر پہ تن جائے گا
ساتویں دروازے کی صُورت ہستی مجھ پر کُھل جائے گی
یا پھر شمعِ ہجر کی صُورت قطرہ قطرہ گُھل جائے گی
یوں لگتا تھا جیسے اب وہ
موڑ بس آنے والا ہے
جس کے بعد اُجالا ہے
(یا پھر باقی عمر کا رستہ اک بے معنی ہالہ ہے!)

اُن آنکھوں کی راہ میں سب یہ
خواب اور خدشے رکھوں گا
اب جو اُن کو دیکھوں گا
اور دیکھ سکا تو پوچھوں گا!

میں اور وہ

میں اُس کو دیکھتا ہوں
پیاس کا مارا ہوا جیسے
بہت ہی فاصلے سے اک کنوئیں کو دیکھتا ہے

میں اُس کو چُومتا ہوں
تاش میں ہارا ہوا جیسے
اخیری داؤ کے پتّے اُٹھا کر چُومتا ہے ۔

وہ تو بھری بہار کے دن تھے!

موسموں کے اس ملنے اور جُدا ہونے سے
جانے دل کا کیا رشتہ ہے!
جب اک موسم دوسرے موسم سے ملتا ہے!
جانے کیوں اس دل کے اندر۔ دُور کہیں پر
ایک چھناکا سا ہوتا ہے
جیسے کچھ شیشے کے برتن
اک وحشی آواز کو سُن کر
نم ہاتھوں سے چھُوٹ گئے ہوں
چھوٹے سے دو ریت گھروندے
بنتے بنتے ٹوٹ گئے ہوں

بجھتی رات کا سناٹا کیوں
خوف رگوں میں بھرتا ہے ؟
پت جھڑ کی دہلیز پہ ٹھہرا
لمحہ کس سے ڈرتا ہے ؟

وہ تو پورے چاند کی شب تھی جب اک تارا ٹوٹا تھا !
وہ تو بھری بہار کے دن تھے جب تو مجھ سے بچھڑا تھا !

ایک کمرۂ امتحان میں

بے نگاہ آنکھوں سے دیکھتے ہیں پرچے کو
بے خیال ہاتھوں سے
اَن بنے سے لفظوں پر اُنگلیاں گھماتے ہیں
یا سوالنامے کو دیکھتے ہی جاتے ہیں!

ہر طرف کنکھیوں سے بچ بچا کے تکتے ہیں
دوسروں کے پرچوں کو رہنما سمجھتے ہیں،
شاید اس طرح کوئی، راستہ ہی مل جائے!
بے نشاں جوابوں کا کچھ پتہ ہی مل جائے!
مجھ کو دیکھتے ہیں تو
یوں جواب کاپی پر، حاشیے لگاتے ہیں
دائرے بناتے ہیں
جیسے اُن کو پرچے کے سب جواب آتے ہیں

اِس طرح کے منظر میں
امتحان گاہوں میں، دیکھتا ہی رہتا تھا
نقل کرنے والوں کے
نت نئے طریقوں سے
آپ لُطف لیتا تھا، دوستوں سے کہتا تھا

کس طرف سے جانے یہ
آج دل کے آنگن میں اک خیال آیا ہے
سینکڑوں سوالوں سا اک سوال لایا ہے

"وقت کی عدالت میں
زندگی کی صورت میں
یہ جو تیرے ہاتھوں میں، اک سوالنامہ ہے
کس نے یہ بنایا ہے!
کس لیے بنایا ہے!
کچھ سمجھ میں آیا ہے؟

زندگی کے پرچے کے

سب سوال لازم ہیں، سب سوال مشکل ہیں!

بے نگاہ آنکھوں سے دیکھتا ہوں پرچے کو
بے خیال ہاتھوں سے
اَن بنے سے لفظوں پر اُنگلیاں گھماتا ہوں
حاشیے لگاتا ہوں
دائرے بناتا ہوں،

یا سوالنامے کو
دیکھتا ہی جاتا ہوں!

○
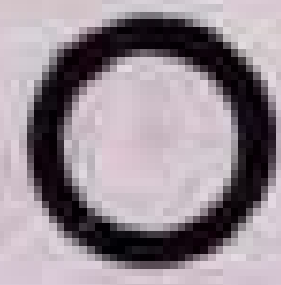
کوئی بھی آدمی پورا نہیں ہے
کہیں آنکھیں، کہیں چہرا نہیں ہے

یہاں سے کیوں کوئی بیگانہ گزرے!
یہ میرے خواب ہیں، رستہ نہیں ہے

جہاں پر تھے تری پلکوں کے سائے
وہاں اب کوئی بھی سایا نہیں ہے

زمانہ دیکھتا ہے ہر تماشہ
یہ لڑکا کھیل سے تھکتا نہیں ہے

ہزاروں شہر ہیں ہمراہ اس کے
مسافر دشت میں تنہا نہیں ہے

یہ کیسے خواب سے جاگی ہیں آنکھیں
کسی منظر پہ دل جمتا نہیں ہے

جو دیکھو تو ہر اک جانب، سمندر
مگر پینے کو اک قطرہ نہیں ہے

مثالِ چوبِ نم خوردہ، یہ سینہ
سُلگتا ہے، مگر جلتا نہیں ہے

خُدا کی ہے یہی پہچان، شاید
کہ کوئی اور اُس جیسا نہیں ہے

پھر بھی

دن رات کے آنے جانے میں
دنیا کے عجائب خانے میں
کبھی شیشے دھندلے ہوتے ہیں، کبھی منظر صاف نہیں ہوتے!
کبھی سورج بات نہیں کرتا
کبھی تارے آنکھ بدلتے ہیں
کبھی منزل پیچھے رہتی ہے
کبھی رستے آگے چلتے ہیں
کبھی آسیں توڑ نہیں چڑھتیں
کبھی خدشے پورے ہوتے ہیں
کبھی آنکھیں دیکھ نہیں سکتیں
کبھی خواب ادھورے ہوتے ہیں
یہ سب تو صحیح ہے لیکن اس
آشوب کے منظر نامے میں
(دن رات کے آنے جانے میں
دنیا کے عجائب خانے میں)

کچھ سایہ کرتی آنکھوں کے پیماں تو دکھائی دیتے ہیں!
ہاتھوں سے اگرچہ دُور سہی، امکاں تو دکھائی دیتے ہیں!
ہاں، ریت کے اِس دریا سے اُدھر
اِک پیڑوں والی بستی کے عنواں تو دکھائی دیتے ہیں!
منزل سے کوسوں دُور سہی
پُر درد سہی، رنجور سہی
زخموں سے مسافر چُور سہی
پر کس سے کہیں اے جانِ وفا
کچھ ایسے گھاؤ بھی ہوتے ہیں جنہیں زخمی آپ نہیں دھوتے
بن روئے ہوئے آنسو کی طرح سینے میں چھپا کر رکھتے ہیں
اور ساری عمر نہیں روتے
نیندیں بھی مہیّا ہوتی ہیں، سپنے بھی دُور نہیں ہوتے
کیوں پھر بھی جاگتے رہتے ہیں! کیوں ساری رات نہیں سوتے!
اب کس سے کہیں اے جانِ وفا
یہ اہلِ وفا
کس آگ میں جلتے رہتے ہیں، کیوں بُجھ کر راکھ نہیں ہوتے!

○
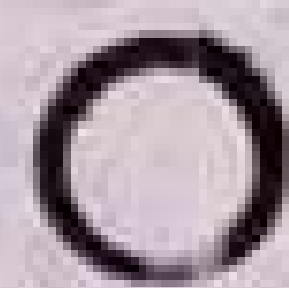
کہاں آ کے رُکنے تھے راستے! کہاں موڑ تھا! اُسے بھول جا
وہ جو مل گیا اُسے یاد رکھ، جو نہیں ملا اُسے بھول جا

وہ ترے نصیب کی بارشیں کسی اور چھت پہ برس گئیں
دلِ بے خبر مری بات سُن، اُسے بھول جا، اُسے بھول جا

میں تو گُم تھا تیرے ہی دھیان میں، تری آس، تیرے گمان میں
صبا کہہ گئی مرے کان میں، میرے ساتھ آ، اُسے بھول جا

کسی آنکھ میں نہیں اشکِ غم، ترے بعد کچھ بھی نہیں ہے کم
تجھے زندگی نے بُھلا دیا، تُو بھی مُسکرا، اُسے بھول جا

کہیں چاکِ جاں کا رفو نہیں، کسی آستیں پہ لہو نہیں
کہ شہیدِ راہِ ملال کا نہیں خوں بہا، اُسے بھول جا

کیوں اَٹا ہوا ہے غبار میں، غمِ زندگی کے فشار میں
وہ جو درج تھا ترے بخت میں، سو وہ ہو گیا، اُسے بھول جا

نہ وہ آنکھ ہی تری آنکھ تھی، نہ وہ خواب ہی ترا خواب تھا
دلِ منتظر تو یہ کس لیے، ترا جاگنا، اُسے بھول جا

یہ جو رات دن کا ہے کھیل سا، اسے دیکھ، اس پہ یقیں نہ کر
نہیں عکس کوئی بھی مستقل، سرِ آئنہ، اُسے بھول جا

جو بساطِ جاں ہی اُلٹ گیا، وہ جو راستے سے پلٹ گیا
اُسے روکنے سے حصول کیا، اُسے مت بُلا، اُسے بھول جا

تو یہ کس لیے شبِ ہجر کے اُسے ہر ستارے میں دیکھنا
وہ فلک کہ جس پہ ملے تھے ہم، کوئی اور تھا، اُسے بھول جا

تجھے چاند بن کے ملا تھا جو، ترے ساحلوں پہ کھلا تھا جو
وہ تھا ایک دریا وصال کا، سو اُتر گیا، اُسے بھول جا

○
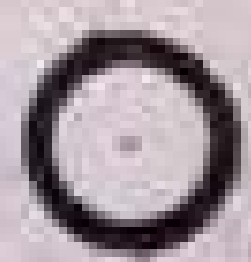
اپنے گھر کی کھڑکی سے میں آسمان کو دیکھوں گا
جس پر تیرا نام لکھا ہے اُس تارے کو ڈھونڈوں گا

تم بھی ہر شب دیا جلا کر پلکوں کی دہلیز پہ رکھنا
میں بھی روز اک خواب تمہارے شہر کی جانب بھیجوں گا

ہجر کے دریا میں تم پڑھنا لہروں کی تحریریں بھی
پانی کی ہر سطر پہ میں کچھ دل کی باتیں لکھوں گا

جس تنہا سے پیڑ کے نیچے ہم بارش میں بھیگے تھے
تم بھی اُس کو چھو کے گزرنا، میں بھی اُس سے لپٹوں گا

"خواب مسافر لمحوں کے ہیں، ساتھ کہاں تک جائیں گے"
تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے، میں بھی اب کچھ سوچوں گا

بادل اوڑھ کے گزروں گا میں تیرے گھر کے آنگن سے
قوسِ قزح کے سب رنگوں میں تجھ کو بھیگا دیکھوں گا

رات گئے جب چاند ستارے مُکھن میٹھی کھیلیں گے
آدھی نیند کا سپنا بن کر میں بھی تم کو چُھو لوں گا

بے موسم بارش کی صُورت، دیر تلک اور دُور تلک
تیرے دیارِ حُسن پہ میں بھی رِم رِم رِم رِم برسوں گا

شرم سے دوہرا ہو جائے گا کان پڑا وہ بُندا بھی
بادِ صبا کے لہجے میں اک بات میں ایسی پُوچھوں گا

صفحہ صفحہ ایک کتابِ حُسن سی کُھلتی جائے گی
اور اُسی کی لَو میں پھر میں تم کو ازبر کر لوں گا

وقت کے اک کنکر نے جس کو عکسوں میں تقسیم کیا
آبِ رواں میں کیسے امجدؔ اب وہ چہرا جوڑوں گا

ہوا سیٹی بجاتی ہے

خزاں کی بالکونی سے
ہوا سیٹی بجاتی ہے
چلو_ چلنے کا وقت آیا

درختوں سے ہزاروں خشک پتّے ٹوٹتے ہیں
اور اُس کے ساتھ اُڑتے ہیں
وہ شاید خود نہیں اُڑتے .....؟
فضا اُن کو اڑاتی ہے
ہوا سیٹی بجاتی ہے
..... تو یہ اُڑتے ہوئے پتّے
گلستاں کے کسی نامہرباں گوشے میں تھوڑی دیر کو رُکتے ہیں
پیلی گھاس کے اُس اجنبی صحرا کو تکتے ہیں

جو اُن کے — اور اُن کے آشیاں کے، درمیاں پھیلا ہوا ہے
اور جس کی حد نہیں ملتی
خزاں اس اجنبی صحرا کی حدِّ ممکنہ سے
اُن کی جانب دیکھتی ہے
اور اک فاتح کی صورت مسکراتی ہے
ہوا سیٹی بجاتی ہے

ہوا سیٹی بجاتی ہے تو یہ رُکتے ہوئے پتّے
کسی انجان سی دہشت کے ڈر سے کپکپاتے ہیں
لرز کر سر جھکاتے ہیں
گلستاں کے کسی نامہرباں گوشے کی پستی سے ہوا اِن کو اُٹھاتی ہے
ہوا ان کو اُٹھا کر شہر کی بے مدّعا سڑکوں پہ لاتی ہے

میں ان پتّوں کو جب شہروں کی سڑکوں پر بکھرتے دیکھتا ہوں
سوچتا ہوں — !
"ادھورے خواب کی صورت یہ بے کل بے نوا پتّے
جب اُڑتے ہیں تو اپنے دل میں کیا کیا سوچتے ہوں گے؟

سفر کے زخم کا کچھ تو مداوا سوچتے ہوں گے؟"
میں اپنے پاؤں سے لپٹا ہوا اک مضطرب پتہ اُٹھاتا ہوں
اور اُس سے پوچھتا ہوں ——— !
مری باتیں وہ سنتا ہے مگر کچھ بھی نہیں کہتا
بس اک زخمی نگہ سے میری جانب دیکھتا ہے
دُکھ بھرا چہرا اُٹھاتا ہے

اچانک وقت رُکتا ہے ———
میں اُس پتے کے چہرے میں خود اپنا عکس پاتا ہوں
کسی انجان سی دہشت کے ڈر سے کپکپاتا ہوں
مری گردن پہ جیسے چھپکلی سی سرسراتی ہے
فضا میں اجنبی سے درد کا کہرا اُبھرتا ہے
نمی سی پھیل جاتی ہے۔ ہوا سیٹی بجاتی ہے
خزاں کی بالکونی سے
ہوا سیٹی بجاتی ہے ... !

———

○

بانجھ ارادہ اور کوئی!
جھوٹا وعدہ اور کوئی!

ہم جیسا کیا دیکھا ہے!
تم نے سادہ اور کوئی

دل میں سارا کھوٹ ہی کھوٹ
تن پہ لبادہ اور کوئی

دیر و حرم تو چھان لیے
دیکھیں جادہ، اور کوئی

دل میں اب کیوں رہتا ہے!
تم سے زیادہ اور کوئی!

نکلے تھے ہم اپنے گھر سے
کر کے ارادہ اور کوئی

آخر کس اُمیّد پہ مانگیں
امجدؔ وعدہ اور کوئی!

قاصد

خوشبو کی پوشاک پہن کر
کون گلی میں آیا ہے!
کیسا یہ پیغام رساں ہے
کیا کیا خبریں لایا ہے!

کھڑکی کھول کے باہر دیکھو،
موسم میرے دل کی باتیں، تم سے کہنے آیا ہے

○
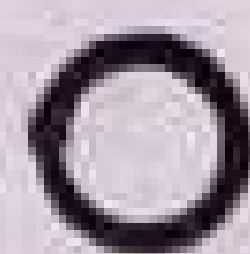
شہد کہیں گے سم کو بھی
جینا تو ہے ہم کو بھی

تجھ بن جلتے دیکھا ہے
پھولوں کے موسم کو بھی

بازاروں میں لے آئے
لوگ تو دل کے غم کو بھی

مہلت آنکھ جھپکنے کی
منظر کو بھی، ہم کو بھی

صدیوں پیچھے بھاگے گا
ٹھہرا جو اک دم کو بھی

قاصد کر کے دیکھیں گے
اب کے چشمِ نم کو بھی

کون یہ پیاسا گزرا ہے؟
توڑ کے جامِ جم کو بھی

مولا — تیری دُنیا میں
چین ملے گا ہم کو بھی!

امجد اُونچا رکھیں گے
جلے ہوئے پرچم کو بھی

○

وہ جو اُوپر ہے بیٹھا ہُوا ، اور ہے
میری بستی کا شاید خدا اور ہے

وصل کی شب تو چمکے تھے تارے بہت
ہجر کی شام کا سلسلہ اور ہے

شہر میں جو اُڑی وہ خبر ، اور تھی
جس سے گزرے تھے ہم، واقعہ اور ہے

کر رہا ہوں مسلسل سفر کس لیے ؟
اُس کی بستی کا تو راستہ اور ہے

خود کو لگتے ہیں کیوں ، اجنبی ، اجنبی !
عکس بدلا ہے یا آئنہ اور ہے

ماند پڑتے ہوئے منظروں کی قسم!
واپسی کے سفر کا مزا اور ہے

دردمندِ وفا، کس طرح سے رُکے!
اس نگر کی تو آب و ہوا اور ہے

اپنے تاروں سے کہنا، چمکتے رہیں!
میری آنکھوں میں اِک رتجگا اور ہے

اب تو ہے راکھ کی ایک مٹھی، یہ دل
جو ہَوا سے لڑا تھا دِیا اور ہے!

صدائے آشنا

تری آہٹ
سُلگتی دوپہر کو ایک پل میں شام کرتی ہے
اُترتی ہے سوادِ ہجر میں کچھ اس طرح جیسے
صدائے آشنا کوئی
گھنے، گہرے، اندھیرے جنگلوں کی بے یقینی میں
رخِ منزل دکھاتی
روشنی کا کام کرتی ہے!

○

ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں، فرصت کتنی ہے؟
پھر بھی تیرے دیوانوں کی شہرت کتنی ہے!

سُورج گھر سے نکل چکا تھا کرنیں تیز کیے
شبنم گُل سے پُوچھ رہی تھی "مہلت کتنی ہے"!

بے مقصد سب لوگ مسلسل بولتے رہتے ہیں
شہر میں دیکھو سنّاٹے کی، دہشت کتنی ہے!

لفظ تو سب کے اک جیسے ہیں، کیسے بات کھُلے؟
دُنیا داری کتنی ہے اور چاہت کتنی ہے!

سپنے بیچنے آ تو گئے ہو، لیکن دیکھ تو لو
دُنیا کے بازار میں ان کی قیمت کتنی ہے!

دیکھ غزالِ رم خوردہ کی پھیلی آنکھوں میں
ہم کیسے بتلائیں دل میں وحشت کتنی ہے!

ایک ادھورا وعدہ اُس کا، ایک شکستہ دل،
لُٹ بھی گئی تو شہرِ وفا کی دولت کتنی ہے!

میں ساحل ہوں امجدؔ اور وہ دریا جیسا ہے
کتنی دُوری ہے دونوں میں، قربت کتنی ہے!

○

شمعِ غزل کی لَو بن جائے ، ایسا مصرعہ ہو تو کہو
اِک اِک حرف میں سوچ کی خوشبو ، دل کا اُجالا ہو تو کہو

رازِ محبّت کہنے والے لوگ تو لاکھوں ملتے ہیں
رازِ محبّت رکھنے والا ، ہم سا دیکھا ہو تو کہو

کون گواہی دے گا اُٹھ کر جھوٹوں کی اس بستی میں
سچ کی قیمت دے سکنے کا تم میں یارا ہو تو کہو!

ویسے تو ہر شخص کے دل میں ایک کہانی ہوتی ہے
ہجر کا لاوا ، غم کا سلیقہ ، درد کا لہجہ ہو تو کہو

امجدؔ صاحب آپ نے بھی تو دُنیا گھوم کے دیکھی ہے
ایسی آنکھیں ہیں تو بتاؤ! ایسا چہرا ہو تو کہو

ابھی تو

ابھی تو رُت بدلنی تھی ابھی تو پھول کھلنے تھے
ابھی تو رات ڈھلنی تھی ابھی تو زخم سلنے تھے

ابھی تو سرزمینِ جاں پہ اک بادل کو گھرنا تھا
ابھی تو وصل کی بارش میں ننگے پاؤں پھرنا تھا

ابھی تو کشتِ غم میں اِک خوشی کا خواب بونا تھا
ابھی تو سینکڑوں سوچی ہوئی باتوں کو ہونا تھا

ابھی تو ساحلوں پر اک ہوائے شاد چلنی تھی
ابھی جو چل رہی ہے، یہ تو کچھ دن بعد چلنی تھی!

○

حضورِ یار میں حرفِ التجا کے رکھے تھے
چراغ سامنے جیسے ہوا کے رکھے تھے

بس ایک اشکِ ندامت نے صاف کر ڈالے
وہ سب حساب جو ہم نے اُٹھا کے رکھے تھے

سمومِ وقت نے لہجے کو زخم زخم کیا
وگرنہ ہم نے قرینے صبا کے رکھے تھے

تمھی نے پاؤں نہ رکھا وگرنہ وصل کی شب
زمیں پہ ہم نے ستارے بچھا کے رکھے تھے

بکھر رہے تھے سو ہم نے اُٹھا لیے، خود ہی
گلاب جو تری خاطر سجا کے رکھے تھے

ہَوا کے پہلے ہی جھونکے سے ہار مان گئے
وہی چراغ جو ہم نے بچا کے رکھے تھے

مٹا سکی نہ انھیں روز و شب کی بارش بھی
دلوں پہ نقش جو رنگِ حنا کے رکھے تھے

حصولِ منزلِ دُنیا کچھ ایسا کام نہ تھا
مگر جو راہ میں پتھر انا کے رکھے تھے

وقت بھی کتنا ظالم ہے

اتنے برس کی دُوری اور مہجوری کے
افسونِ سفر میں لپٹا ہوا
اِک شخص اچانک آن ملا
میں اُس کو دیکھ کے ششدر تھا
وہ مجھ سے سوا حیران ملا

{یہ وقت بھی کتنا ظالم ہے!
اس ہجر میں کیا کیا روئے تھے ہم
اِس یاد میں کیا کیا کھوئے تھے ہم!}

کچھ دیر تو دونوں چپ سے رہے ،
پھر اُس نے کہا — "تم کیسے ہو ؟"
پھر میں نے کہا — "بس اچھا ہوں"

پھر اُس نے کہا ،
" یہ اتنے دنوں کے بعد کا ملنا خوب رہا .... !
کوئی پرانا دوست ملے تو دل کو بھلا سا لگتا ہے ....
یہ شہر تو بالکل بدل گیا .... اب چلتی ہوں ! "

پھر میں نے کہا ،
" میں شام سمے ہر روز یہاں پر آتا ہوں ...
جب وقت ملے تم آ جانا ...
اس وقت مجھے بھی جلدی ہے .... اب چلتا ہوں ! "

یہ وقت بھی کتنا ظالم ہے !!!

دُوسری ملاقات

ہجر کی پہلی شام سے اب تک
جتنی شامیں گزری تھیں!
اُن کی پتھر چُپ میں، میں نے
(اُس کے سامنے کرنے والی)
کیا کیا باتیں سوچی تھیں!

"باتیں، گزرے برسوں کی جو ہم نے الگ سے کاٹے ہیں
غموں کی اور اُن خوشیوں کی ہم جن سے ہو کر گزرے ہیں
جیتوں اور اُن ماتوں کی جو عمرِ رواں کا رزق ہوئیں
آسوں اور اُمنگوں کی جو دشتِ گماں کا رزق ہوئیں"

کیسے کیسے بھٹکے آہو، صحرائے امکاں میں آئے
شمعِ طلب کے کیسے کیسے روشن پہلو دھیان میں آئے

ڈھلتی رات کا جادو ہوگا!
لمحہ لمحہ خوشبو ہو گا!
پھول اور تتلی یکجا ہونگے!
رنگ ہوا سے پیدا ہونگے!

ایک ہی وصل کی بارش سے وہ سارے شکوے دھو دے گا
یعنی میرے ساتھ لپٹ کر، کچھ نہ کہے گا، رو دے گا

ارمانوں کا پھول اچانک کھل ہی گیا
جس کے غم میں آنکھ برستی رہتی ہیں
آج مجھے وہ مل ہی گیا
جس کو میری پیاس ترستی رہتی تھی

وہ ایک چھلکتا جام مرے ہمراہ رہا
آج وہ ساری شام مرے ہمراہ رہا

لیکن اب وہ اور تھا کوئی ، اور تھا اُس کا رُوپ نگر
اوس رُکی تھی آنکھوں میں تو راکھ جمی تھی بالوں پر
اور کوئی تھی دُنیا اُس کی ، اور تھے اُس کے شام وسحر
(میری حیرت لکھی ہوئی تھی شاید میرے چہرے پر!!)

اُس نے کہا ، "تم مجھے نہ دیکھو ، آبِ روانِ وقت سے پُوچھو
جیون کے اس پُل نیچے سے کتنا پانی گزر چکا ہے !
مجھ میں جو اِک شخص تھا زندہ ، وہ تو کب کا بکھر چکا ہے
میں تو فقط رستہ ہوں اُس کا ، دریا جو تھا اُتر چکا ہے

آؤ چلو اب اپنی اپنی دنیا کو ہم لوٹ چلیں
حدِّ ابد تک اس رستے میں بکھرے ہیں غم ، لوٹ چلیں!"

پلٹے ہم تو ہم دونوں کے ساتھ زمانہ پلٹ گیا
اَن دیکھی تعبیر لینے اک خواب پرانا پلٹ گیا

چاروں جانب بکھر رہی تھی
ایک ادھوری تنہائی ،
ہوا نے رُک کر ہم دونوں کو
مُڑتے دیکھا تو گبھرائی
پت جھڑ کی دہلیز پہ اُس نے
پیڑ سے کچھ سرگوشی کی
اِس کے بعد اُس راہ گزر پہ
دُور تلک خاموشی تھی

آسمان پہ بادل تھا اور اُس میں تارے سمٹے تھے
ہم دونوں کے قدموں سے کچھ سوکھے پتّے لپٹے تھے!!

○
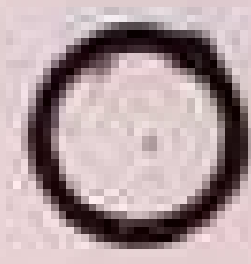
آگ لگی تھی سینہ سینہ، ہر شعلہ جوّالا تھا
اب کے شہر میں روشنیوں کا منظر دیکھنے والا تھا

دروازوں پر پڑے ہوئے تھے ڈھیر شکستہ خوابوں کے
دالانوں میں نفرت کے آسیب نے ڈیرا ڈالا تھا

گلیوں گلیوں بھٹک رہا تھا ایک سنہرا خواب، جسے
میرے بڑوں نے اپنی لاکھوں نیندیں بیچ کے پالا تھا

اپنی اپنی کشتی لے کر یوں دریا میں کود پڑے
جیسے صرف جہاز ہی اس طوفان میں ڈوبنے والا تھا

امجدؔ یہ تقدیر تھی اُس کی یا قدرت کا کھیل؟
گرا جہاں پر رات کا پنچھی، تھوڑی دُور اُجالا تھا

تیرے دھیان کی تیز ہوا

پت جھڑ کی دہلیز پہ بکھرے
بے چہرا پتّوں کی صُورت
ہم کو ساتھ لیے پھرتی ہے
تیرے دھیان کی تیز ہَوا!

○
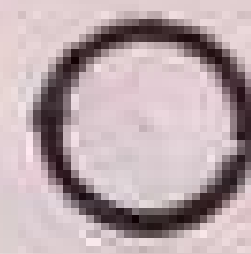
بھیڑ میں اِک اجنبی کا سامنا اچھّا لگا
سب سے چُھپ کر وہ کسی کا دیکھنا اچھّا لگا

سُرمئی آنکھوں کے نیچے پھول سے کھلنے لگے
کہتے کہتے کچھ کسی کا سوچنا اچھا لگا

بات تو کُچھ بھی نہیں تھی لیکن اس کا ایک دم
ہاتھ کو ہونٹوں پہ رکھ کر روکنا اچھّا لگا

چائے میں چینی ملانا اُس گھڑی بھایا بہت
زیرِ لب وہ مسکراتا "شکریہ" اچھا لگا

دل میں کتنے عہد باندھے تھے بھلانے کے اُسے
وہ ملا تو سب ارادے توڑنا اچھا لگا

بے ارادہ لمس کی وہ سنسنی پیاری لگی
کم توجّہ آنکھ کا وہ دیکھنا اچھا لگا!

نیم شب کی خامشی میں بھیگتی سڑکوں پہ کل
تیری یادوں کے جِلو میں گھومنا اچھا لگا

اُس عدوئے جاں کو امجدؔ میں بُرا کیسے کہوں
جب بھی آیا سامنے وہ بے وفا اچھا لگا

جنگلی پھولوں کے لیے - ایک نظم

خوش نما لڑکیو
خوش ادا لڑکیو
تم جو ہنستی ہوئی کھلکھلاتی ہوئی
خوشبوؤں کی طرح رقص کرتی ہوئی
کہکشاں کی طرح جگمگاتی ہوئی
راہ چلتی ہو تو
ایسے لگتا ہے جیسے
زمیں پر دھنک سی اُتر آئی ہو

اپنے بے باک سے قہقہوں میں ترنّم میں گم حبس گھڑی
تم سروں کو جھٹک کر
گھٹاؤں سی زُلفوں کو
چہروں کے جادو گھروں سے ہٹاتی ہو تو
ایسے لگتا ہے جیسے
اچانک فضا میں بہار آگئی ہو!

دُکھوں کا وہ صحرا
جو چاروں طرف پھیلتا جا رہا تھا
سمٹ سا گیا ہے،
مجھے یہ پتہ ہے!
ابھی تم جو اس رہگزر سے
مری سمت دیکھے بنا
اپنی عمروں کی شبنم میں بھیگی ہوئی
خوشبوؤں کی طرح سے گزر جاؤ گی
تو یہ جادو بھی نابُود ہو جائے گا۔

مگر لڑکیو،

خوش نما، خوش ادا، بے خبر لڑکیو
میں تمہارے لیے اپنے دل کی تہوں سے
دُعا مانگتا ہوں
تم یونہی خوش رہو، مسکراتی رہو
سرخوشی کا وہ پَل
جو تمہارے وسیلے سے مرے دل پہ نازل ہُوا ہے
تمہارے شب و روز پر اس طرح پھیل جائے
کہ تم اس کی خوشبو سے مہکی رہو

اور دن ڈوب جائے

○
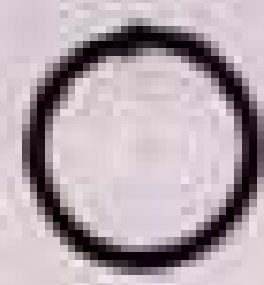
ایک آزار ہوئی جاتی ہے شہرت ہم کو
خُود سے ملنے کی بھی ملتی نہیں فرصت ہم کو

روشنی کا یہ مسافر ہے، رہِ جاں کا نہیں!
اپنے سائے سے بھی ہونے لگی وحشت ہم کو

آنکھ اب کس سے تحیّر کا تماشہ مانگے!
اپنے ہونے پہ بھی ہوتی نہیں حیرت ہم کو!

اب کے اُمید کے شعلے سے بھی آنکھیں نہ جلیں
جانے کس موڑ پہ لے آئی محبّت ہم کو

کون سی رُت ہے زمانے میں، ہمیں کیا معلوم
اپنے دامن میں لیے پھرتی ہے حسرت ہم کو

زخم یہ وصل کے مرہم سے بھی شاید نہ بھرے
ہجر میں ایسی ملی اب کے مسافت ہم کو

داغِ عصیاں تو کسی طور نہ چھُپتے امجد
ڈھانپ لیتی نہ اگر چادرِ رحمت ہم کو

لوگ محبّت کرنے والے

چپکے چپکے جل جاتے ہیں
لوگ محبّت کرنے والے!

پُروا سنگ نکل جاتے ہیں
لوگ محبّت کرنے والے!

آنکھوں آنکھوں چل پڑتے ہیں تاروں کی قندیل لیے

چاند کے ساتھ ہی ڈھل جاتے ہیں
لوگ محبّت کرنے والے!

دل میں پھول کھلا دیتے ہیں
لوگ محبّت کرنے والے!
آگ میں راگ جگا دیتے ہیں
لوگ محبّت کرنے والے!
پانی بیچ بتاشہ صورت خود تو گھلتے رہتے ہیں
سم کو شہد بنا دیتے ہیں
لوگ محبّت کرنے والے!

خواب خوشی کے بو جاتے ہیں
لوگ محبّت کرنے والے!
زخم دِلوں کے دھو جاتے ہیں
لوگ محبّت کرنے والے!
تتلی تتلی لہراتے ہیں پھولوں کی اُمّید لیے
اک دن خوشبو ہو جاتے ہیں
لوگ محبّت کرنے والے!

بن جاتے ہیں نقشِ وفا کا
لوگ محبّت کرنے والے!
جھونکا ہیں بے چین ہوا کا
لوگِ محبّت کرنے والے!
جلی ہوئی دھرتی پہ جیسے بادل گِھر کر آئیں
بستی پر ہیں فضل خدا کا
لوگ محبّت کرنے والے!

○

شہر اُجڑا ہو تو آباد کروں!
جو نہ بھولے اُسے کیا یاد کروں!

ساری چیزیں ہی بدل کر رہ جائیں
اک ہُنر ایسا بھی ایجاد کروں

میرے لفظوں سے نکل جائے اثر
کوئی خواہش جو ترے بعد کروں

بھیک لعنت ہے! ملے یا نہ ملے
کیوں میں رسوائیِ فریاد کروں

کوئی اُس آنکھ پہ شاید اُترے!
روز اک خواب کو آزاد کروں

یہ تو ہے کھیل کا حصّہ امجد
کس لیے شکوۂ بے داد کروں

درد کے رشتے عجب ہیں

درد کے رشتے عجب ہیں
کوئی اِن کی حد نہیں
کوئی ان کی تھاہ نہیں ہے
اور کوئی سرحد نہیں

"یہ" زماں" اور یہ" مکاں"
یہ قربتیں، یہ دُوریاں!
دُور تک بچھتی زمیں اور اُس پہ پھیلا آسماں!"
درد کے رشتوں کے آگے ان کی ساری وسعتیں
ریت کے اک بے ٹھکانہ ذرّے سے زیادہ نہیں

اس گھڑی چاروں طرف اِک ہجر کا آشوب ہے
میرے تیرے درمیاں اک خواب سینہ کوب ہے!

پھر بھی اے جانِ سخن!
جس طرح اہلِ سخن کی گفتگو
کتنی صدیوں کی مسافت ایک پل میں کاٹتی ہے
تیری میری خواہشوں میں، اپنے دُکھ سُکھ بانٹتی ہے

اور جیسے
اجنبی سی کہکشاں سے ڈولتے تارے کی ضَو
روشنی رفتار سے چلتی ہوئی ہم تک پہنچتی ہے
اور جیسے کچھ پرندے
موسموں کے ساتھ اُڑتے
اپنی اپنی منزلوں کے راستوں پر
مستقل پرواز کرتے ہیں
کبھی کی منتظر اور مضطرب شاخوں کی
سیجوں پر اُترتے ہیں

ہمارے خواب بھی (ان کی طرح)
اِک دن ہمارے "ہست"، کی شاخوں پہ اُتریں گے
دھنک کے رنگ ان بھیگی ہوئی آنکھوں پہ اُتریں گے
کہ رشتے درد کے،
منزل بھی ہیں قطبی ستارا بھی !
ہمارے خواب کی تجسیم بھی ہیں
استعارا بھی !

ذکرِ معصومیؔ اور زباں میری
ایسی تاب و تواں کہاں میری
ان کے زورِ بیاں کے جادو سے
ہر طرف پھیلی داستاں میری

دیہی ماحول میں پرکھوں کی نشانی دیکھی
اپنے ڈھلتے ہوئے جیون میں جوانی دیکھی
پڑھ سکا جو نہ کبھی شہر کی دیواروں پر
صفحۂ نازؔ پر اپنی ہی کہانی دیکھی

نبرد آزمائی کو غم کے عدو سے
حسیں لفظوں کا ایک بے پایاں لشکر
چلا عرصۂ زندگانی کی جانب
جلو میں لئے ایک معنی کا دفتر

ہے نازک محبت کا رشتہ بہت
ہے دل آدمی کا شکستہ بہت
نہ اس آبگینے کو ٹھوکر لگے
رکھو اس کو مضبوط و پختہ بہت

یہ جو بندگانِ نیاز ہیں، یہ تمام ہیں وہی لشکری!
جنھیں زندگی نے اماں نہ دی، تو ترے حضور میں آ گئے

تری بے رُخی کے دیار میں، میں ہوا کے ساتھ ہوا، ہُوا
ترے آئینے کی تلاش میں، مرے خواب چہرا گنوا گئے

ترے وسوسوں کے فشار میں، ترا شہرِ رنگ اُجڑ گیا
مری خواہشوں کے غبار میں، مرے ماہ و سالِ وفا گئے

وہ عجیب پھُول سے لفظ تھے، ترے ہونٹ جن سے مہک اُٹھے
مرے دشتِ خواب میں دُور تک، کوئی باغ جیسے لگا گئے

مری عُمر سے نہ سمٹ سکے، مرے دل میں اتنے سوال تھے
ترے پاس جتنے جواب تھے، تری اِک نگاہ میں آ گئے

○

شکستہ لاکھ ہو نیّا کسی کی
نہیں سُنتا مگر دریا کسی کی

ضروری کیوں ہے زخمِ بے وفائی
گزرتی کیوں نہیں، تنہا کسی کی

کسی کے ساتھ سایا تک نہیں ہے
کسی کے ساتھ ہے دُنیا کسی کی

میں آنکھوں میں سجائے پھر رہا ہوں
نشانی ہے مرا صحرا کسی کی

پرانے ملگجے کپڑوں میں امجد
بڑھی کچھ اور بھی شوبھا کسی کی

ہر موسم کا سپنا

موسم موسم آنکھوں کو اِک سپنا یاد رہا
صدیاں جس میں سمٹ گئیں وہ لمحہ یاد رہا
قوسِ قزح کے رنگ تھے ساتوں اُسکے لہجے میں
ساری محفل بھول گئی ، وہ چہرا یاد رہا

ڈرامے

۱۱ - وارث

۱۲ - دہلیز

۱۳ - سمندر (زیرِ طبع)

۱۴ - وقت (زیرِ طبع)

۱۵ - رات (زیرِ طبع)

۱۶ - خواب جاگتے ہیں (زیرِ طبع)

۱۷ - اپنے لوگ (زیرِ طبع)

۱۸ - گھر آیا مہمان (زیرِ طبع)

قیمت : ساٹھ روپے